باب پنجم

جنت

1945ء میں جنرل اختر عبدالرحمٰن نے ایم اے کا امتحان پاس کیا، تو ان کی عمر صرف 20 سال تھی، اپنے بیشتر ہم جماعتوں سے دو سال کم۔ ایم اے کا امتحان دینے کے بعد جواں سال اختر نے سرخوشی اور کسی قدر لاابالی پن سے چند ماہ گزارے۔ اپنی بواجی کی نگران آنکھوں تلے جو تعلیم کو بے حد اہمیت دیتی تھیں، اس نے زندگی کے کڑے امتحان کا ایک مرحلہ سر کر لیا تھا اور بہت دنوں تک کرنے کے کچھ نہ تھا۔ ایک ایسے آدمی کے لیے جو ہمیشہ مصروف رہنے کا عادی تھا اور جو ورزش اور شام کی مختصر سی چہل قدمی کے سوا کبھی کسی تفریح کا عادی نہ تھا، یہ ایک مختلف صورت حال تھی۔ نوجوان آدمی نے امتحان کے نتائج کا انتظار کرنے کے لیے کچھ دن لاہور میں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارے اور پھر اپنے گاؤں میں بواجی کے پاس چلا گیا۔

امتحان کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے وہ ایک بار پھر گاؤں سے لاہور آیا، جہاں اخبار تک دستیاب نہ ہوتا تھا۔ چند دن کے بعد بواجی کو خط ملا کہ ایم اے اقتصادیات کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد وہ ڈی ایس پی بھرتی ہو گیا ہے اور ان دنوں تربیت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ جیسے ہی چھٹی ملے گی، وہ گھر آئے گا اور اپنی بواجی کو بتائے گا کہ اس نے پولیس میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیوں کیا۔

بوا نے خط پڑھا اور گم سم سی بیٹھی رہیں۔ انہیں اس سے واضح طور پر صدمہ پہنچا تھا۔ اگر اس لڑکے کو تھانیدار ہی بننا تھا تو اسے گورنمنٹ کالج ایسے ادارے میں اس چاؤ اور اہتمام کے ساتھ تعلیم دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ بیٹا اب بڑا ہو گیا تھا اور اس نے اپنی مرضی سے زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر لیا تھا۔ بواجی یہ گوارا کر لیتیں، لیکن وہ بہترین سے کم کسی چیز مفاہمت کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ پریشانی کے عالم میں انہوں نے اپنی بڑی بیٹی سلطان کو خط لکھا کہ اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ سلطان جنہیں اختر آپا سلطان کہتے تھے، ریلوے میں ملازمت کرنے والے اپنے شوہر کے ساتھ بمبئی میں تھیں۔ آپا کو یقین تھا کہ وہ اپنے بھائی کو قائل کر سکتی ہیں۔ انہوں نے فوری طور پر اپنے گھریلو ملازم کو ساتھ لیا اور جستر وال روانہ ہو گئیں۔

گاؤں پہنچنے کے بعد انہوں نے بواجی کو سلام کیا، ملازم کو واپس بمبئی بھیج دیا اور بھائی کو تار دیا کہ وہ جستر وال آئے۔ اختر اگلے ہی دن گاؤں پہنچ گئے۔ آپا نے ان سے بحث کرنے کے بجائے صرف یہ کہا کہ وہ انہیں بمبئی چھوڑ آئے۔ یہ چار پانچ دن کا سفر تھا اور ظاہر ہے کہ ٹریننگ کے دوران اتنی طویل رخصت نہیں مل سکتی تھی۔ اختر انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی شادی شدہ بہن، جن سے انہیں ایک خاص تعلق تھا، جستر وال سے بمبئی تک تنہا سفر نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک بھائی کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنی بہن کو عزت اور تکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا کر آئے۔ بہن کی دوٹوک فرمائش، والدہ کی تائید اور گھر میں پھیلی معنی خیز خاموشی کا مطلب واضح تھا۔ اہل خاندان کو گوارا نہیں تھا کہ اختر پولیس کی نوکری کرے۔ ایک ایسے آدمی کے لیے جسے اپنے خاندان سے گہرا تعلق تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ وہ صاف صاف انکار کر دے۔ اگرچہ شروع میں انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن تھوڑے سے تامل کے بعد

آخر کار وہ آمادہ ہو گئے۔انہوں نے پولیس والوں کو استعفا لکھ کر بھیج دیا اور بہن کے ساتھ بمبئی روانہ ہو گئے۔اگلے دو ماہ اختر نے ہندوستان کے کاروباری مرکز میں گزارے، جہاں انہوں نے اپنے بہنوئی کو پولیس کے ساتھ وابستگی کے پس منظر سے آگاہ کیا۔وہ آئی سی ایس افسر بننا چاہتے تھے اور امتحان سے فراغت کے بعد مقابلے کے امتحان منعقد نہیں ہو رہے تھے۔اکاونٹس اور فوج کے علاوہ یہ صرف پولیس کا محکمہ تھا، جہاں بھرتی کا عمل جاری تھا۔چونکہ ان کے لیے فارغ رہنا ممکن نہ تھا، لہٰذا جیسے ہی پولیس کی آسامیاں نکلیں اور ملازمت کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں، تو انہوں نے بھی درخواست بھیج دی اور منتخب کر لیے گئے۔

اختر صبح سویرے اٹھ بیٹھتے اور دیر تک ٹائمز آف انڈیا کا مطالعہ کرتے رہتے۔اخبار سے فارغ ہوتے تو کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ان کے بہنوئی دفتر سے لوٹ آتے تو ان سے گپ شپ ہوتی، لیکن جلد ہی وہ بور ہونے لگے کہ وہ گھومنے پھرنے والے آدمی نہیں تھے۔بمبئی فلمی صنعت کا مرکز تھا۔آئے دن کئی فلمیں ریلیز ہوتی تھیں۔شہر میں تھیٹر والے تھے اور آئے روز ثقافتی تقریبات منعقد ہوتی تھیں، لیکن اختر کو ان میں سے کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ تھی، تو اس بوریت کا کیا حل تلاش کیا جائے۔سفر سے رغبت رکھنے والے ریلوے افسر نے اس کا حل ڈھونڈ نکالا۔انہوں نے دفتر سے چھٹی لی اور وہ ہرن کے شکار کے لیے نکل پڑے۔مختلف علاقوں میں گھومتے پھرے۔دونوں جوان آدمیوں نے اپنی بہت سی راتیں سرکاری ریسٹ ہاوسوں یا جنگلوں اور بیابانوں میں کھلے آسمان تلے گزاریں۔جب وہ لوٹ کر آئے تو تازہ دم اور آسودہ دکھائی دیتے تھے۔

ایک صبح ٹائمز آف انڈیا کا مطالعہ کرتے ہوئے اختر اپنے بہنوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور بلند آواز سے سوچنے کے انداز میں انہیں بتایا کہ فوج میں کمیشنڈ افسروں کے لیے بھرتی کا اشتہار نکلا ہے اور یہ کہ کیا انہیں اس کے لیے درخواست داخل نہیں کر دینی چاہیے۔انہوں نے اس خیال کی پر جوش حمایت کی۔درخواست بھیج دی گئی اور چند ہی روز میں اختر انٹرویو اور امتحان کے لیے طلب کر لیے گئے۔تھوڑے دن بعد اختر واپس آئے انہیں سامان سمیٹ کر دیولالی واپس جانے کی جلدی تھی، جہاں انہیں دو سالہ تربیت سے گزر کر کمیشن حاصل کرنا تھا۔

اختر فوج میں گئے تو جلد ہی ان کی بہن کے میاں کا تبادلہ بمبئی سے سی پی ہو گیا۔جب کبھی ایک رات کے سفر کے بعد وہ بہن اور بہنوئی سے ملنے آتے تو خوش دکھائی دیتے۔فوج کا ادارہ انہیں پسند آیا تھا اور ان کا جی لگ گیا تھا۔وہ ایک محنتی آدمی تھے، اور چیلنج قبول کرنے والے۔وہ ایک ایسی ہی زندگی سے سمجھوتہ کر سکتے تھے، جہاں آزمائش اور امتحان کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔فروری 1947ء سے چند روز پہلے جب آخر کار انہیں کمیشن ملا۔اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا، ''مجھے یقین ہے کہ فوج میں میرا مستقبل شاندار رہے۔''اس وقت برصغیر کی آزادی میں صرف چھ ماہ باقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے۔خاندان کے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے اختر عبدالرحمٰن کے پیچھے ایسی دو عورتوں کا ہاتھ تھا۔ان کی والدہ اور ان کی اہلیہ رشیدہ بیگم۔وہ اس لحاظ سے ایک بڑے ہی خوش قسمت آدمی تھے کہ یہ دونوں عورتیں جو حد درجہ عبادت گزار واقع ہوئی تھیں اور شب و روز خدا کے حضور ان کے لیے دعائیں مانگتی اور ان پر جان چھڑکتی تھیں۔

1949ء میں اختر ترقی پا کر کیپٹن ہو گئے اور نوشہرہ کے آرٹلری سکول میں انسٹرکٹر کے طور پر ان کی تعیناتی عمل میں آ گئی۔ستمبر 1951ء تک وہ یہاں پڑھاتے رہے۔جب انہیں لانگ گنری کورس کے لیے برطانیہ جانا پڑا۔(اپریل 1952ء میں وہ دوبارہ اسی سکول میں پڑھانے کے لیے لوٹ آئے۔)انہی دنوں ان کی بڑی بہن آپا سلطان کے شوہر نصراللہ خان خلیل بھی، جو بعدازاں ریلوے کے ایک بڑے منصب سے ریٹائر ہوئے، اسی شہر میں تعینات کر دیے گئے۔کیپٹن کی والدہ اور ہمشیرہ یکجا ہوئیں تو اس کی شادی کا سوال زیادہ شدت کے ساتھ زیر بحث آنے لگا۔اب وہ 27 سال کے ہو

گئے تھے اور شادی کے لیے ان کی عمر معمول سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ آپا سلطان کی بڑی شدید خواہش تھی کہ ان کے بھائی کی شادی ان کی پھوپھی کی پوتی رشیدہ بیگم سے طے پا جائے۔ آپا سلطان کا بچپن جستر وال میں اسی خاندان کے ساتھ گزرا تھا۔ رشیدہ کی کی بڑی بہن ان کی ہم عمر سہیلی تھیں۔ بچپن ہی سے وہ اس کم گو، سنجیدہ اور شائستہ بچی کو بھائی سے بیاہنے کا خواب دیکھتی تھی، جس کے والد تحصیل دار تھے اور جن کا شمار قصبے کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد رشیدہ بیگم کا خاندان فیصل آباد میں آباد تھا۔ کیپٹن کی والدہ اور بہن نے طویل صلاح مشورے اور کیپٹن کی آمادگی کے بعد پختہ رائے قائم کر لی تو دونوں خواتین نوشہرہ سے فیصل آباد پہنچیں۔ اختر کی والدہ اپنے حسن سلوک کی وجہ سے سسرالی رشتہ داروں میں بڑی مقبول تھیں۔ چنانچہ فیصل آباد میں جو تب ایک چھوٹا سا بے ڈھب قصبہ تھا، ان کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ ماں بیٹی نے روایتی تمہید کے ساتھ جھجکتے ہوئے رشیدہ بیگم کی نانی سے رشتے کی بات چھیڑی تو فوراً ہی اثبات میں جواب ملا۔ ''ہمیں اختر سے زیادہ کون عزیز ہوسکتا ہے۔'' آپا سلطان کو جو مال روڈ لاہور کے ایک بہت پرانے اور کشادہ گھر میں اپنا زیادہ وقت اپنے نواسے نواسیوں کے ساتھ کھیلتے اور عبادت میں گزارتی ہیں، 1952ء میں خزاں کے وہ دن خوب اچھی طرح سے یاد ہیں۔ مرحوم کے ذکر پر بات بے بات رو پڑنے والی آپا کو یاد ہے کہ شادی کی تیاریاں تین ماہ جاری رہیں۔ خوش چہرہ اور سلیقہ مند بہو کے لیے زیور بنوائے گئے، بہت سوچ سوچ کر لباس سلوائے گئے، اور جب بارات نوشہرہ سے فیصل آباد روانہ ہوئی تو اس میں اختر کے بہت سے فوجی دوست اور ان کی بیگمات شامل تھیں۔ خاندان میں طویل عرصے بعد مسرت کی ایک تقریب برپا ہو رہی تھی، لہٰذا جی بھر کر اہتمام کیا گیا، خاص طور پر ولیمے کی دعوت میں۔ وسطی پنجاب سے دور، صوبہ سرحد کے اس شہر میں رشتہ داروں کا زیادہ اجتماع ممکن نہ تھا، لیکن ان میں سے بہت سے شریک ہوئے۔ تاہم فوجی افسروں، پاس پڑوس والوں اور فوجی افسر کے جاننے والوں کی زیادہ بڑی تعداد تقریب میں شریک تھی۔ دولہا، دلہن، دونوں ہی متین مزاج اور کم گو واقع ہوئے تھے، لیکن مہمان خوب چہکے پھرے، کھانے کا خوب اہتمام کیا گیا۔ فوجی بینڈ نے مسرت آمیز نغموں کی دھنیں بکھیریں اور دلہن کو افسروں کی بیگمات نے کئی دن تک گھیرے رکھا۔

سروقد کی پسندیدہ اور شائستہ خاتون نے جلد ہی خاندان والوں کے دل میں گھر بنا لیا اور سب سے زیادہ اپنے دولہا کے دل میں، جو اب تک فرائض کی ادائیگی اور فوج کی سخت زندگی میں منہمک رہا تھا۔ اب جیسے گھر میں ایک پائین باغ آباد ہوگیا تھا۔ زندگی کے لطیف پہلو نے اپنا دروازہ اس آدمی پر کھول دیا تھا اور جو زندگی کو آسائش میں نہیں، جدوجہد میں تلاش کرتا پھر رہا تھا اور جب ایسا ہوا تو لوگوں نے حیرت کی کہ سخت جان آدمی نے مسرت کی سرشاری سے ہم آہنگ ہونے میں تامل سے کام نہیں لیا۔ جاننے والوں کے بہت سے گھروں میں روایت کے مطابق نئے جوڑے کے لیے دعوتوں کا اہتمام کیا گیا اور جلد ہی اردگرد کھسر پھسر سنائی دینے لگی کہ اختر میاں دلہن پر بری طرح ریجھ گئے ہیں۔ پہلے تو وہ کبھی کبھار کلب جانے یا دوستوں سے گپ شپ کا وقت نکال لیا کرتے تھے، اب اس سے بھی گئے۔ ایک شام کسی نے ان پر ''ہنسوں کا جوڑا'' کی پھبتی کسی اور رفتہ رفتہ یہ حکایت عام ہو گئی۔

ہر آدمی اپنی ماں سے محبت کرتا ہے، اپنی بہنوں سے محبت کرتا ہے، اولاد سے محبت کرتا ہے، اور کوئی شائستہ اطوار اپنی بیوی سے تلخی سے پیش نہیں آتا، لیکن اس آدمی کی بات ہی کیا ہے کہ جس پر اس کی ماں، بہنیں، اولاد اور بیوی ہمیشہ جان چھڑکنے کے لیے تیار رہتے ہوں۔ اگر اچھائی کا پیمانہ وہ ہے، جو خدا کے آخری پیغمبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا تھا کہ اچھا وہ ہے، جو اپنے اہل خانہ کے لیے اچھا ہے تو ایسے آدمی کی بھلائی میں کیا شبہ ہوسکتا

ہے۔

جنرل اختر کی والدہ 1982ء میں اپنے خدا کے پاس چلی گئیں۔ ان کی بڑی بہن اور اہلیہ بقید حیات ہیں۔ دو سال گزر جانے کے باوجود ان کی اہلیہ ابھی تک اپنے شوہر کے بارے میں گفتگو کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں کہ مرحوم کا ذکر آئے تو ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی تدوین کے لیے ملاقات کی غرض سے آپا سلطان کو کئی دن تک آمادہ کیا جاتا رہا۔ ان کے بھتیجے اور داماد جن سے مرحوم کو ایک قلبی تعلق تھا، ان سے وعدہ لیا کہ وہ گفتگو کے دوران اپنے جذبات پر قابو رکھیں گی، لیکن پہلے ہی دن گھنٹہ بھر کی بات چیت کے بعد یکا یک بے تاب ہو کر رو پڑیں۔ ''میرے شوہر فوت ہوئے تو اختر نے مجھے سنبھال لیا اور ڈولنے نہ دیا۔ میرے خدا اب میں کس کے لیے زندہ ہوں۔'' انہوں نے چیخ کر کہا اور رو دیں۔ آپا کو یاد ہے کہ وہ کبھی اپنے عدیم الفرصت بھائی کے گھر جاتیں تو وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک انہیں اپنے گھر ٹھہرانے رکھنے پر اصرار کرتے۔ واپسی کا وقت آتا تو وہ سفر کے دوسرے شرکا سے کہتے کہ وہ چاہیں تو چلے جائیں، لیکن ان کی بہن کو ان کے پاس چھوڑ جائیں۔ وہ ان سے خاندان کے امور کے بارے میں مشورے کرتے، ان کے لیے تحائف خریدتے (آپا تمہارے بیڈ روم میں ٹی وی نہیں ہے، یہ روپے رکھ لو، اور ٹی وی خرید لینا، اچھا غازی بیٹے، آپا نہیں مانتیں، تم خرید لاؤ، ان کے کمرے میں ٹی وی تو ہونا چاہیے۔) بہن بیمار ہوئیں تو ان کے کمرے میں ٹیلی فون لگوانے کا اہتمام کیا کہ خود نہیں آسکتے تو فون پر ہر روز خیریت پوچھ لیا کریں۔ عام حالات میں بھی وہ دوسرے تیسرے روز بہن سے فون پر بات کرتے، کبھی کبھی جب وہ انہیں ملنے آتے، تو لاڈ کے ساتھ کہتے، میں ہمیشہ اپنی بہن کا ممنون رہوں گا، جس نے مجھ سے پولیس کی نوکری چھڑوائی۔

اپنے چاروں بیٹوں کے لیے، جن میں سے ہمایوں اختر سیاست میں ہونے کی وجہ سے زیادہ معروف ہیں، وہ کیا تھے؟ محض ایک شفیق باپ نہیں، بلکہ ایک ہمدرد دوست اور ایک آئیڈیل، ایک راہ نما۔ آئی ایس آئی کی تشکیل اور افغانستان کی جنگ آزادی میں اپنے عظیم کارنامے کی وجہ سے جس کی اہمیت کا تعین وقت گزرنے کے ساتھ ہی ہو سکے گا، تاریخ شاید اس آدمی کو یاد رکھے گی، لیکن اس کی زندگی کا سب سے زیادہ حیران کن پہلو بالخصوص اولاد کے معاملے میں گہری دلچسپی، مسلسل منصوبہ بندی، اور ایک بے حد لچکدار اور متوازن رویہ تھا۔ ان کے چاروں بیٹوں میں سے ایک نے ایم بی اے، ایک نے چارٹرڈ اکاونٹنٹ اور دو نے انجینئری کی تعلیم پائی۔ ان چاروں کی زندگی میں آج بھی ان کا شہید باپ سب سے بڑا راہنما تھا۔ اپنے بے تکلف دوستوں کو وہ بتاتے ہیں کہ جب کوئی مشکل مرحلہ، کوئی چیلنج درپیش ہو تو وہ خود سے سوال کرتے ہیں کہ اگر ان کے والد زندہ ہوتے تو کیا رویہ اختیار کرتے۔ ان کے ایک بیٹے نے کہا، ''میں ان کے راستے پر چلنے اور ان کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن پھر میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ یہ آسان نہیں ہے''

دنیا میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی اولاد کی محبت میں اتنا جذباتی ہو اور پھر اتنا عملی، اتنا محتاط اور اتنا متوازن۔ لوگ اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں اور اسے بگاڑ دیتے ہیں یا پھر سخت گیری سے۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن کے اندر کوئی چیز تھی، جو انہیں ہمیشہ بیدار اور چوکس ہی نہیں، بلکہ محتاط بھی رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کی کہ وہ یتیمی میں پلے تھے اور انہوں نے اپنے اردگرد سازشیں برپا ہوتے دیکھی تھیں۔ انہیں والد کی محبت نہ ملی تھی، لہٰذا وہ خاندان اور اولاد کے ہو گئے۔ لیکن انہوں نے اپنے بچوں کو نظم وضبط کا پابند بنایا اور انہیں بگڑنے نہ دیا۔ انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ گہرے اور مسلسل ابلاغ کا رشتہ قائم کیا اور اسے عمر بھر برقرار رکھا۔ ہمایوں کے بقول، میرے والد کہتے تھے کہ مجھ میں اور میری اولاد میں کوئی جنریشن گیپ نہیں اور وہ سچ کہتے تھے۔

شام ہوتی تو وہ اپنے بچوں میں آ بیٹھتے ۔ وہ ان سے سکول میں گزرے ہوئے وقت کے بارے میں پوچھتے ۔ ان سے ہوم ورک کے بارے میں دریافت کرتے ،اور جب اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کی معمول کی پڑھائی ڈھنگ سے ہو رہی ہے تو خود انہیں سکھانے کی کوشش کرتے ۔ وہ قریب رکھی ہوئی رسی، چھت سے لٹکتے پنکھے یا کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے سوال کرتے کہ اسے انگریزی میں کیا کہتے ہیں ۔ وہ بار بار اس لفظ کو دہراتے حتیٰ کہ وہ بچے کی یادداشت کا حصہ ہو جاتا ۔ وہ انہیں کوئی موضوع دیتے اور باری باری سب بچوں کو اس پر تقریر کرنے کے لیے کہتے ۔ جو کوئی ڈھنگ کی بات کرتا، اسے کوئی چھوٹا سا انعام دیا جاتا ۔ وہ انہیں سوال کرنے پر اکساتے اور ہر سوال کا جواب دیتے ۔ ہارون خان کو یاد ہے کہ جب ایوب خان کے دور میں پنڈت نہرو پاکستان کے دورے پر آئے تو بھارت سے نفرت کرنے والے افسر کے بیٹے نے ان سے سوال کیا کہ ہم بھارتی وزیراعظم کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتے ۔ دیر تک وہ اپنے بیٹے کو بتاتے رہے کہ دنیا کے رسم و رواج کیا ہیں ۔ سفارت کاری اور حکومتوں کے باہمی مذاکرات کیا ہوتے ہیں اور یہ کہ لڑائی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں ۔

اولاد سے اس قدر محبت کرنے والے آدمی کے لیے بچوں پر سختی کرنا آسان نہیں تھا، لیکن جب ضرورت پڑتی تو وہ ایسا کرتے ۔ ان کے لیے آموختہ یاد کرانے ، ہوم ورک کرنے اور کھیلنے کا وقت مقرر تھا، جس کی سختی سے پابندی کی جاتی ۔ یہ اس وقت بھی ہوتا جب گھر میں مہمان آئے ہوئے ہوتے ۔ شوخی یا کھیل کود پر آمادہ کسی بچے کو سات منٹ کی مہلت دی جاتی اور اسے محبت سے سمجھایا جاتا، لیکن اگر وہ راہ راست پر نہ آتا، تو ڈانٹ پڑتی اور ایسی سختی کے ساتھ اس سے حکم کی تعمیل کرائی جاتی، جو بظاہر گھروں کا نہیں ، دفتری نظم و نسق کا خاصا ہوتا ہے ۔ باپ کو ہمیشہ یہ خیال تھا کہ کسی بچے میں محرومی کا احساس پیدا نہ ہونے پائے ،لہٰذا ان کے بیٹوں کے بقول ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ انہیں سزا دی گئی ہو، تو کچھ ہی دیر بعد باپ نے محبت کے ساتھ بیٹے کو سینے سے نہ لگایا ہو ۔ وقت گزرنے کے ساتھ گھر اور بچوں کی مشغولیت بڑھتی گئی ، جب تک وہ بریگیڈیئر نہیں بنے تھے تو وہ کوئٹہ ،نوشہرہ ، ایبٹ آباد اور راولپنڈی کی شاموں میں دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیلنے کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے، لیکن پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا ۔

وہ اپنے بچوں کو کس طرح سکھاتے تھے اور ان سے کس طرح گفتگو کرتے تھے، ان کے ایک بیٹے نے بتایا کہ ایبٹ آباد کی ایک سرد سہ پہر کو جب بارش برس رہی تھی ، وہ اسے ساتھ لے کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے ۔ انہوں نے اپنے بیمار بچے کو اسپتال لے جانے والے مالی کی طرف اشارہ کیا اور اپنے بیٹے کو بتایا کہ زندگی میں کس طرح امتحان اور آزمائشیں آتی ہیں ۔ انہوں نے بتایا کہ ایک باپ کے لیے اپنے بیمار بچے کے ساتھ بارش میں اسپتال جانا کس قدر تکلیف دہ ہے اور پھر اسے یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ایک تعلیم یافتہ اور صحت مند آدمی زیادہ بہتر طور پر زندگی کے چیلنج کا سامنا کر سکتا ہے ۔

جنرل نے اپنی اولاد کے لیے وقت اور توجہ ہی نہیں ، روپے پیسے کے معاملے میں بھی بڑے ایثار سے کام لیا ۔ پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں ، جب وہ اعلیٰ افسر نہیں بنے تھے، اور فوجی افسروں کی تنخواہیں بھی نسبتاً کم تھیں ، ان کے بچے اعلیٰ اداروں میں تعلیم پاتے تھے ۔ ان کے ایک ساتھی نے ایک بار دریافت کیا کہ وہ بچوں کی تعلیم پر کس طرح زائد اخراجات کے متحمل ہو رہے ہیں ۔ ''میرے پاس کار نہیں ہے ۔'' انہوں نے کہا، ''اور میں بعض دوسری آسائشوں سے بھی دستبردار ہو سکتا ہوں ، لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ بچوں کی تعلیم میں کسی اعتبار سے کوتاہی کروں ۔'' حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ پر بعض بڑی سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں ۔ وہ ڈھاکہ میں ہوں ، کوئٹہ ، راولپنڈی یا ایبٹ آباد میں ، وہ گھر سے باہر کچھ نہیں کھاتے تھے ۔ خوش ذوق آدمی نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ دو پتلونوں ، دو بش شرٹوں اور ایک آدھ شلوار قمیص کے ساتھ گزارا ۔ یہ صورت حال اس وقت تک برقرار رہی

، جب تک ان کے بیٹے امریکہ سے ان کے لیے لباس اور دوسری اشیا بھجوانے لگے۔ ان کے بیٹے، آج بھی اپنے والد کے ایثار کا تذکرہ کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتے ہیں، جنھوں نے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے فوجی افسر کے طور پر حاصل ہونے والا واحد رہائشی پلاٹ بیچ ڈالا تھا۔ ان کے بیٹوں میں سے جب کوئی اس ایثار کا حوالہ دیتا، تو جنرل اختر عبدالرحمٰن ہمیشہ اپنی ہموار آواز میں یہ جواب دیتے کہ انہوں نے کسی بڑے ایثار سے کام نہیں لیا اور یہ کہ انہیں وہی کچھ کرنا چاہیے تھا، جو انہوں نے کیا۔ ایک گھریلو تقریب کی وڈیو فلم میں جوان کی شہادت سے کچھ پہلے منعقد ہوئی، انہیں اپنے بیٹے کی طرف سے اس تحفے کا پیکٹ موصول ہونے کے بعد اس کے ساتھ لکھے گئے خط کو پڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس خط میں اولاد سے ان کی غیر معمولی محبت اور قربانیوں کا تذکرہ ہے۔ جنرل نے ایک آدھ فقرہ پڑھا، پھر جذبات کی شدت سے ان کی زبان گنگ ہوگئی اور آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

جنرل کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ ان کے چاروں بیٹے، جنھوں نے اعلیٰ تعلیم پائی، مغرب کی چکا چوند سے متاثر اور بے راہرو نہیں ہوئے۔ وہ مسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ ان میں سے کسی نے ان کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کی۔ ان کے چاروں بیٹوں، اکبر، ہمایوں، ہارون، اور غازی خان کی شادیاں ان کی مرضی سے انجام پائیں۔ اگرچہ ہر رشتے میں بچوں کی رضا مندی حاصل کی گئی۔ ''ہماری شادیاں اس طرح نہیں ہوئیں کہ والدین نے طے کر لیا اور لڑکے کو ہانکتے ہوئے لے گئے۔'' ہمایوں اختر نے کہا، ''وہ ہمارے ساتھ دوستانہ انداز سے بات کرتے تھے، وہ صاف صاف پوچھتے تھے کہ فلاں خاندان کی فلاں بیٹی سے شادی کرنا پسند کرو گے۔'' ان کے ایک بیٹے قریبی رشتہ داروں کے ہاں اور تین ممتاز فوجی افسروں جنرل زاہد علی اکبر، جنرل رحیم الدین، اور ائر وائس مارشل صدر الدین کے ہاں بیاہے گئے۔ اختر عبدالرحمٰن کہتے تھے کہ اپنے والد کی طرح وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، پھر یہ کہ انہیں اپنے والد کا پیار نصیب نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنے بچوں کے ساتھ گہری وابستگی میں اس کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی اور مرحوم کے بقول، وہ اس میں کامیاب رہے۔ ''خدا نے مجھے دنیا ہی میں اپنی محرومیوں کا صلہ دیدیا۔'' ایک بار انہوں نے کہا۔

جنرل اختر کے چار بیٹے تھے اور بیٹی ایک نہ تھی۔ ایک بار انہوں نے کہا، خدا نے مجھے ایک بیٹا عطا کیا تو میں نے اس کا جشن منایا۔ دوسری بار بھی میں نے بیٹے کے لیے دعا کی، تیسری اور چوتھی بار بھی۔ وہ اپنی اولاد کی تعلیمی استعداد اور جسمانی صحت مندی ہی کے لیے منصوبہ بندی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے بھی متفکر رہتے تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے غازی خان، 1978ء میں چارٹرڈ اکاونٹنٹ کی ڈگری کے لیے امریکہ جا رہے تھے، وہ اسے ائر پورٹ پر چھوڑنے گئے، اور کہا، ''بیٹا، کل تک تمہاری عزت میرے ہاتھ میں تھی اور آج میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' ان کے بچوں کا کہنا ہے کہ امریکہ میں قیام کے دوران انہیں ہمیشہ اس امر کا خیال رہا کہ کہیں ان کی وجہ سے ان کے باپ کی تکریم پر حرف نہ آئے، جو اپنی توقیر کے معاملے میں اس درجہ حساس واقع ہوئے تھے۔

ہارون خان نے، جو اب ایک صنعتی ادارے کے سربراہ ہیں، بتایا کہ بچپن میں ایک بار انہوں نے ملازم کے کوارٹر میں پڑا مٹی کا تیل شربت سمجھ کر حلق میں انڈیل لیا، جس سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ ملازم چست اور سمجھ دار آدمی تھا۔ اس وقت بچے کو اسپتال لے گیا، جب ان کی والدہ گھر پر نہیں تھیں اور والد غسل خانے میں تھے۔ جیسے ہی انہیں صورت حال کا علم ہوا، وہ بھاگتے ہوئے اسپتال پہنچے۔ ہر حال میں اپنی بیداری اور حوصلہ مندی قائم رکھنے والے آدمی نے ڈاکٹر سے بچے کی زندگی کے بارے میں پوچھنے کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ کیا اس حادثے کا اس کی آئندہ زندگی پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ انہیں ہمیشہ یہ فکر رہی کہ ان کے بچے زندگی میں بہترین صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوں اور ان میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہ رہ جائے۔ ان کی ساری زندگی اس مقصد کے لیے سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرتے گزری۔

انہوں نے اپنی اولاد کو شائستگی اور دیانت داری سکھانے کی کوشش کی۔ انہیں بتایا کہ زندگی میں توازن کی اہمیت کیا ہے اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ ایک مسلمان کو ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ نیویارک میں کاروباری مشاورت کا ادارہ چلانے والے اکبر کہتے ہیں کہ جب وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں تعلیم پا رہے تھے تو ان کے والد انہیں ہمیشہ فراخدلی سے روپے بھیجتے تھے۔ معمول کی مقررہ ماہانہ رقم کے علاوہ اگر اچانک زاید روپوں کی ضرورت پڑ جاتی تو وہ انہیں خط لکھتے یا فون کرتے، ''یاد نہیں پڑتا کہ کبھی انہوں نے یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو کہ روپے کس مقصد کے لیے درکار ہیں۔''

ہمایوں کی بیٹی ثنا کے ساتھ، جو اب لاہور میں تیسری جماعت میں تعلیم حاصل کر رہی ہے، وہ غیر معمولی لاڈ پیار کے عادی تھے۔ یہ بچی آزادی کے ساتھ ان کے کمرے میں آتی جاتی دیکھی جاسکتی تھی۔ 5 اگست 1988ء کو اس بچی کی چھٹی سالگرہ پر ان کے سکول کے ساتھیوں سمیت 40، 50 بچوں کو مدعو کیا گیا۔ گھر کو روشنیوں سے سجایا گیا، جب کیک کاٹنے کا وقت آیا اور انہیں بتایا گیا کہ سفر سے لوٹ کر آئے اور تھکے ماندے ہمایوں اپنے کمرے میں سو رہے ہیں، تو انہوں نے خود آ کر کیک کاٹا، لیکن مصروف آدمی اس کے بعد اپنے کمرے میں واپس نہیں گیا، وہ تقریب کے خاتمے تک وہی ٹھیرے اور بچوں سے باتیں کرتے رہے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے، کہ ان کے بچوں میں سے کوئی احساس محرومی کا شکار ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ جب وہ زندگی کے چیلنج کرنے اور آزمائشوں سے دوچار کرنے والے میدان میں داخل ہوں تو وہ جمی جڑی مضبوط اور پر اعتماد شخصیتوں کے مالک ہوں اور وہ یہ بات جانتے تھے کہ اس کے لیے والدین کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

جنرل کی زندگی میں ان کی والدہ کا کردار بڑا گہرا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسری ہستی اس دائرے میں داخل ہوئی اور بتدریج اس کا کردار بڑھتا چلا گیا۔ یہ ان کی اہلیہ رشیدہ بیگم تھیں۔ جنرل اختر اپنے گردوپیش کے لوگوں سے بڑی توقعات رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ ان سے ہر وقت چوکس رہنے، وقت کی پابندی کرنے اور مطلوبہ نتائج فراہم کرنے کا مطالبہ کرتے تھے اور اس معاملے میں خاصے بے لچک واقع ہوئے تھے۔ (اسی لیے ان کے بعض ماتحت انہیں ناپسند کرتے تھے۔) رشیدہ بیگم ان ہستیوں میں سے ایک ہیں، جنہوں نے خود کو جنرل کی پسند و ناپسند کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ وہ اس اعتبار سے ایک مثالی مشرقی خاتون ہیں کہ انہوں نے خود کو اپنے شوہر اور خاندان کے لیے وقف کر دیا۔ ان کے مزاج کی لچک، خدمت گزاری اور غیر معمولی سوجھ بوجھ نے اس میں ان کی بڑی مدد کی اور انہوں نے جنرل کے گھر کو جنت بنا دیا۔

جنرل اختر صبح چھ بجے سو کر اٹھتے اور غسل خانے کا رخ کرتے تو ان کی خواہش ہوتی کہ وہ جیسے ہی باہر نکلیں، چائے کی پیالی میز پر دھری ہو۔ چائے کی یہ پیالی انہیں ہمیشہ میز پر رکھی ہوئی ملتی۔ وہ چائے پیتے اور اخبار پڑھنے میں محو ہو جاتے۔ وہ اخبار دیکھ چکتے تو غسل کرتے۔ اسی دوران ان کی وردی استری کر کے لائی جاتی۔ رشیدہ بیگم اپنے ہاتھوں سے رینکس، فارمیشن سائن اور کالر کے نشانات وردی پر سجاتیں۔ گندگی اور بے ترتیبی سے چڑنے والے آدمی کو اپنی وردی سے بڑی محبت تھی، جیسی کہ ایک تکمیل پسند فوجی افسر کو ہونی چاہیے۔ جیسے ہی وہ غسل خانے سے باہر پاوں رکھتے، یہ وردی ان کو پیش کی جاتی، اگرچہ ہمیشہ اس کا احتیاط سے جائزہ لے لیا جاتا تھا، لیکن وہ خود بھی اس کا کڑی نظر سے معائنہ کرتے۔ اگر کہیں ذرا سا داغ، دھبہ بھی دکھائی دیتا تو ان کے لیے دوسری متبادل وردی لائی جاتی، جو ہمیشہ تیار رکھی جاتی تھی اور اس کے ساتھ پالش سے چمکتا ہوا جوتا، جرابیں، ٹوپی اور گھڑی۔

وہ ٹھیک وقت پر ناشتہ کرنے کے عادی تھے اور اس میں ذرا سی تاخیر بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جنرل حمید کے بقول جو ان کے افسر رہے اور جن سے مرحوم کو خاص تعلق خاطر تھا، جنرل اختر ایک فوجی کے طور پر اپنے مزاج میں قدیم انگریز افسروں کی طرح تھے، دیانت دار، وقت کے پابند اور

بہترین سے کم کسی چیز پر مفاہمت نہ کرنے والے۔ میز پر پہنچنے سے پہلے ان کے لیے ناشتہ چن دیا جاتا۔اس دوران رشیدہ بیگم باورچی خانے کا چکر لگا کراس امر کا جائزہ لیتیں کہ سب چیزیں ڈھنگ سے تیار کی گئی ہیں یا نہیں۔ وہ ہلکا سا ناشتہ کرتے تھے۔ ذرا سا دلیہ، ایک آدھ ٹوسٹ، بغیر زردی کے تلا ہوا انڈا، ذرا سا پھل یا جوس لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی چیز معیار سے گری ہوئی یا بدذائقہ ہو۔ ہمیشہ مصروف عمل رہنے اور ہمیشہ سوچ بچار کرنے والے آدمی کو اس بات سے بڑی چڑ تھی کہ جب وہ دوپہر میں گھر لوٹیں، تو صفائی کا عمل جاری ہو۔لہٰذا اگر کوئی میلا سا پردہ دھلنا ہوتا تھا، یا کسی جگہ کیل ٹھونکا جانا تھا، یا کسی کمرے کا فرش صاف ہونا تھا، تو یہ سب کام ان کے لوٹ آنے سے پہلے مکمل کر لیے جاتے اور سہ پہر کو یہ صاحب خانہ کے لیے انتظار کرتا ہوا گھر ہوتا۔

جتنی دیر میں وہ لباس تبدیل کرتے، میز پر کھانا چن دیا جاتا۔اپنی صحت کا خیال رکھنے والے آدمی کو ہمیشہ اصرار تھا کہ اس کے لیے پکائے گئے کھانے میں گھی اور مرچ کم ہو، (کبھی کبھار گوشت اور زیادہ تر سبزی) اور پھر اس کا ذائقہ بھی اچھا ہونا چاہیے۔ دوپہر کو گھنٹہ بھر آرام کرتے اور اس وقت وہ ذرا سی مداخلت بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سو کر اٹھتے تو ورزش کا سامان، پتلون، جرابیں، اور پی ٹی شوز وغیرہ تیار رکھی ہوتیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے سیر کے لیے نکل جاتے تو گھر میں ایک بار پھر حرکت کے آثار پیدا ہوتے اور باقی ماندہ کام تیزی سے نمٹائے جاتے تاکہ جب وہ لوٹ کر آئیں تو گھر پھر سے پرسکون اور مرتب ہو۔ واپس آ کر جرنیل شلوار قمیص پہن لیتا، ٹیلی فون پر دفتر والوں سے گفتگو کرتا، ضروری فائلوں پر نظر ڈالتا، بیوی بچوں سے گپ شپ کرتا، حتیٰ کہ رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔

اس ساری ترتیب اور اہتمام کے لیے رشیدہ بیگم کو بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی، لیکن انہوں نے کبھی یہ شکایت نہ کی کہ ان پر کام کا بوجھ لدا رہتا ہے ۔اس کے برعکس وہ ایک عبادت کی طرح اس کا اہتمام کرتیں۔ مہمانوں کا خیال رکھتیں اور بچوں کا بھی۔ایک بار جنرل نے کہا،'' ساری زندگی مجھے اپنے بچوں کے حوالے سے کبھی الجھن کا سامنا نہیں ہوا۔ میں نے ہمیشہ انہیں صاف ستھرے لباس میں دیکھا، انہوں نے کبھی اس طرح کی ہنگامہ آرائی نہیں کی، جس سے میرے کام میں خلل پڑے اور میں اس کے لیے اپنی بیوی کا ممنون ہوں۔''

اپنی اہلیہ کے لیے جنرل کی ممنونیت محض اس لیے نہ تھی کہ وہ ان کا اس درجہ خیال رکھتی تھیں۔اس کے کچھ دوسرے اسباب بھی تھے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے جنرل کی والدہ کی، جن سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے، اس طرح خدمت کی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ان کے ایک بیٹے نے بتایا کہ 1981ء میں جب وہ کچھ دن کے لیے امریکہ سے راولپنڈی آئے تو انہوں نے اپنی والدہ کو اپنی دادی اماں کے کپڑے استری کرتے اور ان کے پاوں کی مالش کرتے دیکھا۔ وہ ایک لیفٹیننٹ جنرل کی اہلیہ تھیں، اور گھر میں نوکر چاکر موجود تھے، لیکن وہ جنرل کی والدہ کے کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کو ترجیح دیتیں۔ 1982ء میں جب بواجی کو دل کا دورہ پڑا اور انہیں لاہور کے کمبائنڈ ملٹری اسپتال داخل کرایا گیا، تو رشیدہ بیگم روزانہ سولہ، سولہ گھنٹے تک اسپتال ان کی خبر گیری کرتی رہتیں۔ وہ فخر سے کہتی ہیں، بواجی ان کے لیے دعا کرتی رہی تھیں اور یہ کہ اس سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہو سکتا۔

وہ جنرل کے رشتہ داروں کا خود ان سے بڑھ کر خیال رکھتیں، خاص طور پر ان کا جو بعض اوقات حادثات کے دباو کا شکار ہوتے۔ وہ ان کے لیے چپکے چپکے ضرورت کی چیزیں اور روپے بھجواتیں، حتیٰ کہ بعض اوقات تو جنرل اس پر قدرے پریشان ہو کر کہتے کہ تم ان کی عادتیں بگاڑ دوگی۔

وہ اس امر کا خیال رکھتیں ہ ان کے ہمیشہ مصروف رہنے والے شوہر کو ان کی وجہ سے کسی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ جب وہ کبھی انہیں کسی چیز کی طرف توجہ دلانا، یا کسی ناخوشگوار واقعہ سے مطلع کرنا چاہتیں تو ان کے خوشگوار موڈ یا شام کے فارغ لمحات کا انتظار کرتیں۔ ان میں گفتگو اور ابلاغ کا

غیر معمولی سلیقہ پایا جاتا تھا اور انہوں نے اپنی اولاد کو بھی یہ سکھانے کی کوشش کی کہ گفتگو کا سلیقہ زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے، لیکن خاندان کے لوگ ان کی بصیرت اور سوجھ بوجھ پر غیر معمولی اعتماد رکھتے ہیں اور اب بھی ہر معاملے میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن ایک فوجی افسر کے طور پر اپنی تقریروں کو بہت سنجیدگی سے لیتے تھے۔ جب وہ تقریر لکھ چکتے تو ہمیشہ اپنی اہلیہ سے اس پر مشورہ کرتے۔

عبادت گزار خاتون پر ان کے دادا کا گہرا اثر تھا، جو بہت متین اور مذہبی آدمی تھے۔ ان کی حقیقی تعلیم دراصل وہی ہے، جو کچھ انہوں نے گھر میں رہتے ہوئے اپنے دادا سے سیکھا اور ہمیشہ یاد رکھا۔ وہ ہمیشہ سے اپنے دادا کی طرح مذہبی واقع ہوئی تھیں۔ لیکن 1965ء کی جنگ نے انہیں اس طرح بدل ڈالا جیسے کوئی قلبی واردات ایک صوفی کو بدل ڈالتی ہے۔ میجر اختر عبدالرحمٰن تب برکی کے محاذ پر تھے۔

وہ ہمیشہ منکسر المزاج تھیں۔ وہ اپنے بیٹوں سے کہتیں، جب درخت پر پھل لگتا ہے تو وہ جھک جاتا ہے۔ ان کی بڑی بہن کے بقول جب ان کے بچوں کی تعریف کی جاتی تو وہ کہتیں، ''نہیں، کوئی ایسی خاص بات تو نہیں۔'' انہوں نے اپنے دادا سے سیکھا تھا کہ جب کوئی تعریف کرے تو اسے من وعن قبول کر لینا اور اس پر پھول جانا احمقوں کا کام ہے۔ تقریبات میں وہ ہمیشہ اس امر خیال رکھتیں کہ کسی کو ان سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ فوجی افسروں کی بیگمات، تقریبات میں پروٹوکول کا بڑا خیال رکھتیں، جتنا کہ خود ان کے شوہر۔ آئی ایس آئی یا چیئرمین جوائنٹ چیفس آف کمیٹی کی اہلیہ کی حیثیت سے کسی تقریب میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو ہوتیں اور وہاں ان کا سامنا اپنے شوہر کے کسی سینئر کی اہلیہ سے ہو جاتا تو وہ انہیں گاڑی تک چھوڑنے جاتیں، اور انتظار کرتیں کہ وہ ان سے پہلے گاڑی میں سوار ہو جائیں۔

ہمیشہ ان کا معمول رہا کہ جب ان کے گردوپیش کوئی بیمار ہو جاتا، خاص طور پر جاننے والی خواتین میں سے، تو وہ اس کی ڈھارس بندھاتیں، اور اس کی تیمارداری کرتیں۔ وہ ضرورت مندوں کی مدد کرتیں، اور بعض اوقات اپنے ہاتھوں سے دوسروں کے لباس سیتیں۔ ایک بار تو ان کے شوہر اس پر ان سے بگڑ گئے۔ انہوں نے ادھ سلے کپڑے اٹھا کر پھینک دیے اور کہا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے آمادہ رہتیں، حتیٰ کہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کی شادی کے موقع پر انہوں نے اپنی کلائیوں سے سونے کی چوڑیاں اتار کر اسے دیدیں۔

جنرل کے ایک پرانے اے ڈی سی نے ایک بار کہا، ''میں نے دنیا میں ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔'' ان کے ایک صاحب زادے نے کہا کہ ان کے والد کی ترقی میں ان کی والدہ کی انکساری و عاجزی، خدمت خلق اور عبادت گزاری کا حصہ ہے۔ خاندان کو جاننے والی ایک خاتون نے کہا، اس گھر کے سکھ چین میں رشیدہ بیگم کی بے ریا خدمت اور سلیقہ مندی کا کردار کسی چیز سے کم نہیں۔

رشیدہ بیگم نے ایک بار اپنے شوہر سے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے خدا سے اپنے میاں اور بچوں کی صحت اور خوشی کے لیے دعا کرتی ہیں، لیکن انہوں نے کبھی ان کی ترقی کے لیے دعا نہیں کی۔ وہ ہمیشہ بڑی دلسوزی سے ایک اور دعا بھی کرتی رہیں کہ جب موت کا لمحہ آئے تو وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ہاتھوں سے قبر میں اتاری جائیں۔ جب کسی ایسی خاتون کے انتقال کی خبر آتی، جس کے جنازے کو اس کے میاں کا کندھا نصیب ہوتا تو وہ ہمیشہ کہتیں، ''وہ ایک خوش نصیب عورت ہے۔'' اب وہ اپنے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی کہتی ہیں کہ خدا نے معلوم نہیں، ان کی یہ دعا کیوں قبول نہ کی۔

اب ان کا زیادہ تر وقت عبادت اور تسبیح و وظائف میں گزرتا ہے۔ کبھی کسی مدرسے کے بچوں کی ایک ٹولی گھر میں داخل ہوتی دکھائی دیتی ہے، وہ دیر تک تلاوت کرتے رہتے ہیں، بکرے ذبح کیے جاتے ہیں اور گوشت بانٹا جاتا ہے۔ وہ خواب دیکھتی ہیں اور ان میں کھوئی رہتی ہیں۔

17 اگست کے سانحہ کے بعد جب ہمایوں اختر نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو وہ انہیں اس سے منع کرتی رہیں۔لیکن پھر انہوں نے ایک روز اپنے شوہر کو خواب میں دیکھا اوران کا اشارہ پا کر اس پر آمادہ ہو گئیں۔

جنرل کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ بار بار کہتی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کی زندگی میں خدا سے جا ملنے کی خواہاں تھیں،لیکن ان کی آرزو پوری نہ ہوسکی اور انہیں میاں کی موت کا صدمہ سہنا پڑا۔خاندان کے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہوسکیں گی،لیکن رفتہ رفتہ اپنے بیٹوں اور بہوؤں کی مدد سے وہ سنبھلنے لگیں۔

ایک ایسے گھر میں، جہاں سب لوگ ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوئے ہوں، جدائی کا لمحہ اور بھی دل گداز ہوتا ہے۔1982ء میں جب اختر کی والدہ کا انتقال ہوا تو بہت دن تک ان کی یہ کیفیت تھی کہ وہ راتوں کو سوتے ہوئے اچانک ''بوا، بوا'' کہتے اٹھ بیٹھتے،اوران کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔1982ء میں لاہور میں بوا جی کو دل کا دورہ پڑا تو جنرل بہت گھبرائے،لیکن وہ منہ پکا کے انہیں تسلی تشفی دیتے رہے۔وہ اس وقت راولپنڈی میں تھے، جب انہیں والدہ کے انتقال کی خبر دی گئی۔ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر وہ لاہور پہنچے۔جب وہ بوا جی کے بستر کے قریب پہنچے، جہاں وہ سفید کفن میں ملبوس محو خواب تھیں،تو یکا یک ان کے قدموں پر سر رکھ کر رو پڑے۔دیر تک روتے رہے، پھر سر اٹھایا اور کہا،''ان قدموں تلے تو میری جنت تھی۔''